عقیدۂ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو

(از: عبدالحمید)

[اس مضمون کی پہلی قسط نومبر ۱۹۵۴ء کے ترجمان میں شائع ہو چکی ہے۔]

علمأ اسلام نے صرف کائنات اور اس کے خارجی مظاہر کو ہی جاننے کی کوشش نہیں کی بلکہ دین کے محکمات کے نیچے فلسفہ عمرانی کی جو ایک جوئے حیات رواں دواں ہے، اس میں غوطہ لگا کر تازگی اور زندگی کا راز دریافت کیا اور پھر اس سے نوع انسانی کو آشنا کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے جس جس گوشے سے متعلق تفصیلی ہدایات پیش فرمائی تھیں، ان سے جزئیات مرتب کیں، اور پھر ان کی راہنمائی میں ان مسائل کو حل کیا ۔۔۔ جن کو تاریخ کی اضطراری چال نے جنم دیا تھا۔ مسلم قوم کی اس کاوش اور تلاش وجستجو کو اسلامی اصطلاح میں "اجتہاد" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملت اسلامیہ میں اسے ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ یہ فرض سب سے پہلے رسول اللہؐ کے رفقاء کار نے سرانجام دیا، ان کے بعد اس فرض کی ادائیگی میں بے شمار علمائے امت نے اپنی کاوشیں وقف کیں۔ امام ابوحنیفہ، امام مالکؒ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل، قاضی ابی یوسف، غزالی، خطابی، عزالدین ابن عبدالسلام، اشعری، ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ ایسے جلیل القدر علمائے اسلام سب اسی ایک کام کی وجہ سے تاریخ اسلام میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر جتنے انبیاء گزرے ہیں ان کے ماننے والوں نے دینی مصالح کو سمجھ کر ان سے تفصیلات اخذ نہیں کیں۔ ان میں یقیناً بہت سے ایسے علماء نظر آتے ہیں جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے جزوی احکامات مستنبط کئے۔ مگر ان میں اور علمائے اسلام میں ایک بنیادی اور اساسی فرق نظر آتا ہے اور اس فرق کو ہر وہ شخص جان سکتا ہے جس نے مختلف مذاہب کی تاریخ کا ایک محققانہ اور گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔

اُن کی تحقیقات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہر زمانے کے نئے نئے تقاضوں اور نئے نئے مسئلوں کے متعلق دو مختلف اور متضاد طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک گروہ نے معاشرہ کے ارتقا کا سرے سے انکار کر کے بغیر کسی فکری کاوش کے انبیاء علیہم السلام کے احکامات کو اندھا دھند نافذ کرنا شروع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ انسانی نے جب کوئی ورق الٹا تو اس میں خدا کے ان "پاکباز" بندوں کی تعلیمات بھی گم ہو کر رہ گئیں۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ نے بجائے اصل تعلیمات کے مضمرات کو ڈھونڈ کر ان کو وقت کی مناسب جزئیات پر اطلاق کرنے کے خود اپنی من گھڑت باتوں کو دین کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا۔ ہوا و ہوس کے غلام انسانوں کو جب "مقامِ کبریائی" پر فائز ہونے کا زعم ہونے لگا تو وہ اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکے اور انھوں نے رشد و ہدایت کے اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے خود اپنے نفس سے ایسی ایسی چیزیں وضع کرنا شروع کیں جن کی اصل دین میں معمولی سے معمولی گنجائش بھی نہ تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر میں اصل دین بے وقعت ہو کر رہ گیا۔ اور عقیدت کا مرکز ان کی اپنی شخصیتیں اور خیالات بن گئے۔ زمانہ نے جس قدر ترقی کی عوام اسی نسبت سے اپنے اصل مرکز سے ہٹتے چلے گئے۔ اور ایک وقت ایسا آیا جس میں کبھی اس امر کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی کہ ان حضرات سے ان کے پیش کردہ افکار و خیالات کی سند بھی پوچھ لی جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن حکیم ان کی اس غلطی کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورہ آل عمران)	کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔

ان آیات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق کسی کو مطاعِ مطلق مان لینا ہی اس کو رب قرار دینے کے مترادف ہے۔ اور یہ مقام صرف خدا کے لیے ہی مخصوص ہے۔ رسولؐ کی بھی بلا چون و چرا پیروی صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اسے خود اپنے احکامات کا پیامبر بنایا ہے، اور اس کے افکار و اعمال کے ذریعہ وہ نوعِ انسانی پر اپنا منشا واضح کرتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ان "فرستادوں" کے علاوہ

دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو منزہ عن الخطا ہونے کا دعویٰ کر سکے، اور نوع انسانی سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اس کے ہر قول و فعل کو بغیر کسی سند کے قبول کر لو۔

عیسائیت میں اس کے برعکس دیکھیے کہ وہاں پوپ کی عصمت کیتھولک مسیحیوں اور پادریوں کے اجماع یعنی کلیسا (CHURCH) کی عصمت کل مسیحیوں کا متفقہ عقیدہ رہا ہے:

"ایک مخصوص کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے۔ اس لیے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہے ہی نہیں۔"[۵]

مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے درمیان اس ضمن میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس نے ان کے خیالات و افکار کے علاوہ ان کی معاشرتی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے:

عامۃ المسلمین کے سامنے جب کوئی نیا نظریہ، یا خیال پیش کیا گیا، تو انھوں نے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کس قدر اقرب ہے، انھوں نے اس کا مزاج جتنا اس کے قریب پایا، اسی نسبت سے اسے جلدی قبول کیا اور جہاں یہ دیکھا کہ اس کا تعلق اپنے ماخذ سے کم ہے، وہاں اسے ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ پوری قوت سے دبانے کی بھی کوشش کی۔

یہی نہیں بلکہ خود ان بزرگان دین نے دوسرے مذاہب کے علماء کے برعکس بالکل ایک دوسری پوزیشن اختیار کی۔ انھوں نے لوگوں سے یہ کہنے کی بجائے کہ تم ہمارے اقوال کو بالکل بے خطا اور تنقید سے بالاتر سمجھو۔ ان سے اس امر کا تقاضا کیا کہ ان کی کسی رائے کو ماننے سے پیشتر اسے کتاب و سنت کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔ اور اگر وہ ان کے قریب ہو تو مان لو، ورنہ رد کر دو۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

ما من احد الا هو ماخوذ من كلامه ومردود عليه الا رسول الله	رسول اللہ کے سوا ہر شخص کے کلام میں قابل اخذ اور قابل ترک باتیں ہیں۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے بھی فرمایا:

لا ينبغي لمن لم يعرف دليلي ان يفتي بكلامي	جو شخص یہ نہ معلوم کر سکے کہ ایک بات میں نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی وہ میرے قول پر فتویٰ نہ دے۔

ENCYCLOPEDIA BRITANNACA VOL 16. P 940 ۵

قاضی ابو یوسف، فقہ حنفی کے ایک دوسرے بزرگ نے بھی یہی ارشاد فرمایا:

لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا ما لم یعلم من این قلنا

یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ بات ہم نے کہاں سے کہی ہے۔

عصام بن یوسف سے پوچھا گیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ بہت سی باتوں میں امام ابو حنیفہؒ صاحب سے بھی اختلاف کر جایا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اسلام میں اجتہاد کی روح کو سمجھنے کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہنے لگے" اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کو فہم و فراست میں سے وہ حصہ عطا فرمایا ہے جو ہم کو نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے وہ ایسی باتوں تک پہنچ جاتے ہیں جن تک ہم نہیں پہنچ پاتے۔ اور یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ ہم ان کے کسی قول پر بلا سمجھے بوجھے فتویٰ دے دیں۔

امام شافعیؒ نے بھی اس امر کی تاکید فرمائی ہے:

مهما قلت من قول او اصلت من اصل فبلغ عن رسول الله خلاف ما قلت فالقول ما قاله صلی الله علیه وسلم

میں جو بات بھی کہوں اور جو اصول بھی ٹھہراؤں جب اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہ سے مل جائے تو پھر حضورؐ کی بات اصل ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سلسلہ میں یہ قطعی فیصلہ صادر فرما دیا:

لیس لاحد مع الله رسوله کلام

اللہ اور رسول کی بات کے ہوتے ہوئے کسی بات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

پھر چونکہ یہ حضرات حق کو اپنے ہی اقوال کے اندر محدود نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے قلوب میں وسعت نگاہوں میں بلندی اور علم میں کشادگی پیدا ہوئی۔ انھوں نے اپنے طرز عمل میں زیادہ سے زیادہ رواداری پیدا کی اور اپنی فطرت کو زیادہ سے زیادہ آفاقی اور مزاج کو حقیقت پسند بنایا۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کا دائرہ ممکن حد تک وسیع کیا تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ افراد سما سکیں۔ مسلم قوم کی اسی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے

اپنی کتاب "اسلام اور احمدیت" میں لکھا ہے:

"یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات (THEOLOGY) میں اختلاف کی وجہ سے اکثر و بیشتر ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگاتے رہتے ہیں۔ دینیات کے فروعی مسائل کے اختلاف میں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں ملحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان، جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ پروفیسر ہرگرانج (HURGRONJE) کہتے ہیں کہ جب ہم فقہ اسلامی کے نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ ایک طرف تو ہر زمانے کے علما خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر کفر کا الزام عائد ہوجاتا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحادِ عمل کے ساتھ اپنے پیشروؤں کے اختلاف رفع کرتے ہیں۔"

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے اس پر ایک گہری نگاہ ڈالیے اور پھر اس امر کا جائزہ لیجیے کہ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل اسلام کے کس بنیادی فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ اس معاملہ پر جس قدر بھی غور کریں گے یہی پائیں گے کہ ملتِ اسلامیہ کا یہ ذہنی ارتقا صرف ختمِ نبوت کی وجہ سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ وحی کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا، اس لیے مسلمانوں نے خدا کے منشا کو حضور کی تعلیم سے اخذ کرنے کی کوشش کی۔ حد تو یہ ہے کہ جہاں جہاں مسلمانوں نے ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا وہاں بھی دلیل صرف یہی پیش کی گئی کہ اس معاملے میں "میرے سرکار نے یوں حکم دیا ہے"۔ یہی ایک مرکزِ ثقل ہے جس کی طرف امتِ مسلمہ کا ہر ہر فرد خواہ اس کا تعلق کسی طبقے یا زمانے سے ہو جھکتا رہا اور جب تک وہ دنیا میں موجود ہے جھکتا رہے گا۔ اس کی متجسسانہ نگاہیں ہمیشہ افکار و خیالات، نظریات اور تصورات کے سنگریزوں میں اُن ہیروں کی متلاشی رہیں جن میں انہیں نبوتِ محمدی کی جوت نظر آئے۔

یہ طرزِ عمل اپنے نتائج کے اعتبار سے تاریخ انسانی میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

کائنات اسباب و اثرات کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے۔ اور طبیعی قوانین کا پابند ہے۔ انہیں قوانین کی تلاش و جستجو کائنات کے مختلف گوشوں میں وحدت پیدا کرتی ہے انسان نے جس رفتار سے انہیں دریافت کیا، اسی سرعت کے ساتھ زمان و مکان کے اسرار و رموز اس پر کھلتے چلے گئے اور بالآخر اس نے ان دونوں کو مسخر کر کے پوری کائنات کو ایک وحدت کی حیثیت سے استعمال کرنا شروع کیا۔

آج سے چند سال پیشتر اس وحدت کی آخری شکل جو ممکن تصور کی جا سکتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ایک ہی زمانے میں ملک، رنگ، نسل کے اختلافات کو یکسر ختم کر کے پوری دنیا کو ایک اکائی اور پوری نوع انسانی کو ایک وحدت بنا دیا جائے مگر عصرِ حاضر نے اپنی نت نئی ایجادات اور اختراعات سے انسانیت کو وحدت کے وسیع تر مفہوم سے آشنا کیا ہے۔ چنانچہ اس نئی وحدت کے لیے نہ صرف مکان کی تسخیر ضروری معلوم ہوئی بلکہ زمانہ کا حجاب ختم کر دینا بھی لازمی سمجھا گیا۔ اس نئے نظریہ کے مطابق زمان منفرد آنات کا ایک تواتر ہے اور اس لحاظ سے اس کائنات کے سارے واقعات و حادثات ایک متحرک جلوس کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

تسخیر زمان و مکان کا یہ عمل صرف آب و گل کی دنیا میں جاری نہیں بلکہ اس کا سلسلہ قوانین اخلاق میں بھی موجود ہے۔ البتہ ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ پایا جاتا ہے کہ نظام تکوینی کے قوانین انسان اپنی کاوش و محنت سے دریافت کرتا ہے مگر اس کے برعکس انسانی ہدایت کا ضابطہ باری تعالیٰ خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے انبیاء کے ذریعہ انسانوں پر نازل فرماتے ہیں۔ ان دونوں میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے انسانیت کے راستے سے زمان و مکان کی رکاوٹوں کو ختم کر کے اسے ایک وحدت بنانے کا عزم کیا جو کام عالم طبیعات میں قوانین طبیعی کی دریافت سے سر انجام پایا، وہی کام عالم اخلاق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ختم ہونے کی وجہ سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ حضور سرور دو عالم نے جس طرح انسان کے گرد وطنیت کی دیواروں کو گرا کر اسے ایک دوسرے سے بالکل قریب کر دیا، اسی طرح انہوں نے اس قوم کو عقیدہ ختم نبوت عطا فرما کر ماضی و حال کے تفرقہ کو بھی یکسر مٹا ڈالا۔ حضورؐ کے دوسرے احسانات کی طرح

انسانیت پر یہ بھی ایک عظیم احسان ہے کہ انھوں نے قانون شرعی کو اپنی آخری شکل میں پیش فرما کر اخلاقی اعتبار سے ازل و ابد کی طنابیں کھینچ دیں اور انسان پر اس راز کو آشکارا کیا کہ جس طرح قانون طبعی کے مطابق یہ کائنات ایک وحدت ہے۔ اسی طرح قانون اخلاق کی رُو سے بھی یہ ایک ہی ہے۔ ہمیں امروز و فردا کے درمیان جو حجابات نظر آتے ہیں وہ محض ہماری نظر کا دھوکہ ہیں ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک　　دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم　(اقبال)

دنیا کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قدیم اقوام اور مذاہب میں اس قسم کے تصورات عام طور پر پائے جاتے ہیں کہ فلاں شخص، گروہ یا طبقہ کسی مذہبی رہنما کا وارث ہے اور اس وجہ سے وہ دوسرے پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس قسم کی برتری کا احساس اسلام سے قبل اکثر گروہوں میں موجود تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ وہ آخری نبی ہیں جن کو انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا اور ان کے بعد قیامت تک کے لیے یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اس لیے حضور نے اپنا وارث کسی فرد یا خاندان کو نہیں ٹھہرایا بلکہ خلافت کا تاج پوری امت کو پہنایا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ　(النور، ۷)　اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور عمل صالح کیا کہ وہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

یہ تصور مسلم قوم کے اندر ہر قسم کی نسلی اور نسبی فضیلتوں کو ختم کر کے شرافت اور نیکی کو معیار بزرگی ٹھہراتا ہے اور یہ ایک ایسی منزل ہے جس کی طرف ہر فرد بڑھنے کے لیے یکسر آزاد ہے اور ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہیں۔ اس راہ میں کسی پر کوئی پابندی نہیں اور دنیا کی کوئی چیز اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے لوگوں نے آپ کے خاندان کی نسبت جب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا تھا "سلمان ابن اسلام" یہ جواب ایک شخص کا جواب نہیں بلکہ ایک تہذیب کا جواب ہے، جو انھوں نے زندگی کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دیا تھا۔ اقبال نے اس واقعہ کو اپنے اس شعر میں نقل کیا ہے ؎

فارغ از ارباب دام و اعمام باش　　ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

اسی طرح اس اعتقاد نے کہ حضورؐ کی وارث پوری ملت اسلامیہ ہے، نہ کہ ایک فرد، خاندان یا کوئی مخصوص طبقہ اسلامی سوسائٹی کو قیصریت، پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست (THEOCRACY) کے فتنوں سے بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ یہاں اب کوئی شخص یہ کہہ کر اپنی بات نہیں منوا سکتا کہ چونکہ اس کا تعلق فلاں نسل یا نسب سے ہے جو خدا کو زیادہ عزیز ہے اس لیے اس کے قول کو بلا سند تسلیم کر لیا جائے۔ یہاں اُسے اپنے اس نسب کی وجہ سے سماج میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو برتری کسی انسان کو مل سکتی ہے وہ اس تقویٰ کی وجہ سے ہے جسے اُس نے اپنی ذات میں پیدا کیا۔

مگر اس ضمن میں یہ یاد رہے کہ اُس کی نیکی کا یہ امتیاز اُسے قانون سے بالاتر نہیں بنا سکتا۔ قانون کی نظر میں مسلم سوسائٹی کا ہر فرد، خواہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا وضیع، آمر ہو یا مامور دوسرے کے برابر ہے۔ کسی کے عابد و زاہد ہونے سے قانون کے اجرا و نفاذ میں سر مو کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سختی سے اس اصول کی اہمیت کو واضح فرمایا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ چوری کی سزا اسلام میں ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ لوگوں نے جب عورت کے خاندان کی عظمت اور پھر سزا کی نوعیت پر نگاہ کی تو بعض لوگوں کو یہ چیز گراں گزری اور انھوں نے قانون کے استعمال میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہا جس کے وہ جاہلیت میں عادی تھے۔ چنانچہ اسامہ بن زیدؓ سے جو آنحضرتؐ کو نہایت محبوب تھے درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارہ میں آپؐ سے سفارش کریں۔ انھوں نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپ ان پر نہایت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ تم اللہ کی حدود کے معاملہ میں سفارش کرتے ہو؟ پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں یہ فرمایا کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے اور اگر کوئی با اثر آدمی چوری کرتا تو اس سے وہ درگذر کر جاتے۔ لیکن میں ایسا نہیں کرنے کا۔"

خطبہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدھا	اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ لیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ضروری ہدایت دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

لیس بین اللہ وبین احد نسب الا بطاعتہ فالناس شریفھم ووضیعھم فی دین اللہ سواء

اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مگر اس کی اطاعت کے واسطہ سے۔ اس وجہ سے خدا کے قانون میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

اسلام کا یہ جلیل القدر فرزند خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد خود اپنے اہل وعیال کو یہ تنبیہ فرماتا رہتا تھا۔

لا اعلمن احدا وقع فی شئ مما نھیت عنہ الا اضعفت لہ العقوبۃ

جن باتوں کی میں نے ممانعت کر رکھی ہے اگر تم میں سے کوئی ان میں مبتلا پایا گیا تو یاد رکھو اس کو دوگنی سزا دوں گا۔

اس کے علاوہ اس تصور نے حکومت پر کسی خاص فرد یا گروہ کی اجارہ داری کو ختم کر کے اُسے عامۃ المسلمین کا حق قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی ریاست کی عاملہ عام مسلمانوں کی رائے سے ہی بنتی ہے، وہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوتے ہیں۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہوتا، وہ مسلمانوں کے اجماع سے ہی طے کئے جاتے ہیں، اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوتا ہے وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل اس فرض کو سرانجام نہیں دیتا بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کا حق رکھتا ہے جس نے اس کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ یہاں جس شخص کو خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے اس کی اصل حیثیت صرف یہی ہے کہ تمام خلفا اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ مگر خلافت کی یہ خلعت اسے سوسائٹی میں کسی امتیازی سلوک کا مستحق نہیں ٹھہراتی۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور گذارش یہ ہے کہ ختم نبوت کے عقیدہ ہی نے مسلمانوں کے نظام مملکت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ انسانوں کو براہ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں تاکہ غلطی کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ حضور سرور دو عالم نے خود اپنی زندگی میں نہ صرف مشوروں کو سنا، بلکہ ان میں سے بعض کو

قبول فرما کر اُن پر عمل بھی کیا۔ اسی سے اسلام میں شورائی نظام کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔

اس سلسلے میں قرآن مجید نے جو اصولی ہدایت دی ہے وہ یہ ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ ۳۸) اور ان کا نظام باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔

اس اصولی ہدایت کی وضاحت بھی خود حضور نے اس طرح فرمائی تھی

حدثنی ابوسلمة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الامر یحدث لیس فی کتاب ولا سنة فقال ینظر فیه العابدون من المؤمنین۔

مجھ سے ابوسلمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے فیصلہ کریں گے۔

اسی اصول پر سرور عالمؐ کے صحابہؓ سختی سے کاربند رہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جو اسلام میں پہلے خلیفہ ہیں مسلمانوں کے مشورہ عام ہی سے خلیفہ منتخب ہوئے اور خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد تمام امور کا فیصلہ جن کے بارہ میں کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت موجود نہ تھی لوگوں کے مشورے ہی سے کیا ان کے اس طرز عمل سے متعلق سنن دارمی کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:

حدثنا میمون بن مهران فقال کان ابوبکر اذا ورد علیه الخصم نظر فی کتاب اللہ فاذا وجد فیه ما یقضی بینهم قضی به وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک الامر سنة قضی به فان اعیاه خرج فسأل المسلمین وقال اتانی کذا وکذا فهل علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی فی ذالک بقضاء

ہم سے میمون بن مہران نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابوبکر کے پاس فریق معاملہ کوئی مقدمہ لاتے تو وہ پہلے اس پر کتاب اللہ کی روشنی میں غور کرتے۔ اگر اس میں ان کو کوئی ایسی چیز مل جاتی جس سے ان کے معاملے کا فیصلہ ہو سکتا تو اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کر دیتے۔ اور اگر کتاب اللہ میں انہیں اس کے فیصلے کے لیے کوئی چیز نہ ملتی اور سنت رسول اللہ میں کوئی چیز مل جاتی تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کرتے لیکن اگر سنت رسول اللہ میں بھی کوئی چیز نہ پاتے تو مسلمانوں سے دریافت کرتے

فربما اجتمع الیہ النفر کلھم یذکر من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ قضاء فیقول ابوبکر الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ علی نبینا فان اعیاہ ان یجد فیہ سنۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع رؤس الناس وخیارھم فاستشارھم فاذا اجتمع رایھم علی امر قضی بہ

کہ میرے سامنے اس طرح کا معاملہ آیا ہے کیا کسی شخص کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا فیصلہ ہے جو اس قسم کے معاملہ سے متعلق ہو؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کے پاس متعدد ایسے اشخاص جمع ہو جاتے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بیان کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ امت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول کا علم محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اس تلاش کے بعد بھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے لیڈروں اور ان کے اچھے لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر جم جاتے تو اس کے مطابق وہ معاملے کا فیصلہ کر دیتے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس شورائی نظام نے جس حد تک ترقی کی اس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی تصنیف "الفاروق" میں وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔

"حضرت عمرؓ نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی اور اگرچہ وقت کے اقتضا سے اس کے تمام اصول و فروع مرتب نہ ہو سکے۔ تاہم جو چیزیں حکومت جمہوری کی روح ہیں سب وجود میں آگئیں ان میں سب کا اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا۔ یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا"[2]

"مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کی مشورت۔ احسان و تبرع کے طور پر نہ تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں

لَاخِلَافَةَ اِلَّاعَنْ مَشْوَرَۃٍ۔[3]

۱؎ یہ سب عبارتیں مولانا امین احسن کے مضمون اسلام میں شوریٰ اور قانون سازی کی صحیح نوعیت سے نقل کی گئی ہیں۔

۲؎ الفاروق ص [illegible] - ۳؎ الفاروق ج [illegible]

مجلس شوریٰ کے بارے میں یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ اس میں وہی لوگ شریک کئے جاتے تھے جنھیں عوام کا اعتماد حاصل ہو، اور جو دینی و دنیوی معاملات میں گہری بصیرت رکھتے ہوں۔

پھر مشورہ صرف مجلس شوریٰ کے ارکان سے ہی نہ لایا جاتا بلکہ جب کوئی ضرورت پیش آتی تو عام رعایا سے بھی رائے طلب کی جاتی۔ مولانا شبلی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ عام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت حاصل تھی۔ صوبجات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کئے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا تھا۔ کوفہ بصرہ اور شام میں جب عمال خراج مقرر کئے جانے لگے تو حضرت عمر نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص انتخاب کرکے بھیجیں جو ان کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانتدار اور قابل ہو۔[1]

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خداوندتعالیٰ نے اس دنیا میں نبوت کا وارث پوری امت کو قرار دے کر اگر ایک طرف اس کے مقام کو بلند کیا ہے تو دوسری طرف اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۱۶)	اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (البقرہ ۱۶)

خداوندتعالیٰ کا یہ ارشاد جہاں مسلمانوں کو "امت وسط" ہونے کی بشارت دے رہا ہے وہاں وہ اس حقیقت کو بھی ان پر واضح کر رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کے طور پر اٹھنا ہوگا اور اپنے قول و فعل سے اس بات کو ثابت کرنا ہوگا کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا ہے، وہ تم نے عوام الناس تک پہنچانے میں اور جو کچھ اس مقدس ذات نے تمہیں دکھایا ہے اسے نوع انسانی کو دکھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور جب تک تم اس دنیا میں موجود ہو تمہیں "شاھد علی الناس" کے اس مشن کی تکمیل میں مصروف رہنا ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خداترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی

---

[1] الفاروق ص ۳۰۸

جو تعلیم تمہیں دی ہے، اسے اپنے افعال و کردار میں قیامت تک کے لیے محفوظ رکھنا تمہارا فرض ہے اور اسی میں تمہاری زندگی ہے۔ دین کی کامیابی بھی اسی سے وابستہ ہے اور آخرت کی فلاح کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ یہ عقیدہ ایک مابعد طبیعی تصور کی حیثیت سے دین اسلام میں شامل نہیں بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کی ترتیب و تشکیل میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی ایک عقیدہ ہے جس نے مسلمانوں کے سامنے قیامت تک ایک پیکرِ محسوس کی شکل میں واحد معیارِ حق پیش کیا، انھیں رشد و ہدایت کی معروضی قدریں عطا کیں۔ اُن کے باہم اجزا کو ایک امت بنایا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور عقل و فکر سے خود کام لینا سکھایا، عالم اخلاق میں زمان و مکان کی ساری حدبندیوں کو ختم کیا اور ملّتِ اسلامیہ میں ہر قسم کے نسلی، نسبی اور قومی امتیازات کو مٹا کر سوسائٹی میں ایک صحیح قسم کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی مساوات کی داغ بیل ڈالی۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما	از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است	جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
ما ز حکمِ نسبتِ او ملّتیم	اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
دامنش از دست دادن مُردن است	چوں گل از بادِ خزاں افسردن است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما	ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
فرد از حق ملت از وے زندہ است	از شعاعِ مہرِ او تابندہ است
(رموزِ بے خودی)	(اقبال)

(بقیہ، اسلام اور ہمارا قانونی نظام) کیا گیا تاکہ دخترِ رز کے ساتھ ساتھ دخترانِ مصر کو بھی غیروں کے سامنے پیش کیا جائے۔ آخر ہماری حکومتیں شراب و شاہد کو اجنبیوں کی خدمت میں پیش کرنے میں کیوں بخل سے کام لیتیں جب کہ انھوں نے اپنے سارے ملکی ذرائع و وسائل اور اموال و اسباب کو لا کر غیروں کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔[1]

[1] قارئین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ مصر کی دردناک داستان پاکستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کی داستان سے کس قدر مشابہ ہے۔ (ترجمان)